اکبر اور اقبال کا فلسفۂ آزادی

محمد لقمان

Muhammad Luqman

Ph.D Scholar, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Akber and Iqbal were renowned philosophers and poets of Sub-continent. More and less, they found the same epoch. They became paramour of vigilance and liberty to the Muslims of Sub-continent. They escaped the Muslims from servitude of colonial powers. They used their revolutionary poetry as a strong tool against Imperialism. Liberation and subjugation are specific postulates of their philosophy. They appropriated their art of poetry for the passion of enfranchisement and emancipation. They admonished the Muslim nation in their poetry that self-respect, self-consciousness, cogent economy and National bashfulness is inevitable for freedom. They presented in their philosophy that independence is life whereas slavery is death. They searched for the reasons of Muslim slavery in poverty, illiteracy and unemployment. Acquisition of separate territory was their verteran dream. Consequently, due to their liberation struggle Pakistan came into existence as a seperate Muslim State.

اکبرالٰہ آبادی اور علامہ محمد اقبال برصغیر پاک و ہند کے نامور مفکر، فلسفی اور شاعر ہیں۔ دونوں نے کم و بیش ایک جیسا عہد پایا۔ انھوں نے غلامی اور غفلت کی نیند سوئی ہوئی قوم کو آزادی اور بیداری کی حقیقی روح سے آشنا کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر کو سامراج کی محکومی سے نجات

دلائی۔ بالخصوص اکبر نے ایک ماہر جراح کی طرح طنزیہ اور مزاحیہ انداز اپناتے ہوئے ،فکرِ آزادی کے نشتر سے قوم کے محکومی پر مبنی متعفن ناسوروں کا علاج کیا تو اقبال نے ایک سنجیدہ طبیب کی صورت حبوبِ بیداری سے قوم کی محکومی و لاچاری کا مداوا کیا۔ دونوں شعرا نے فلسفیانہ شاعری کے توسط سے محکوم قوم کو آزادی کا مژدہ سنایا لیکن ان کا انداز جدا جدا تھا۔ اکبر نئی تہذیب سے کنارہ کشی، مکمل سائنسی و فنی تعلیم کے حصول اور قومی فکر و احساس کی راہ پر چل کر آزادی کی منزل پر پہنچتے ہیں جب کہ اقبال نے جذبۂ حب الوطنی، قومی غیرت، جذبۂ جہاد، نشاطِ ثانیہ اور عظمتِ رفتہ میں قوم کی آزادی کا راز تلاش کیا۔ انھوں نے سامراجیت کے خلاف اپنی انقلابی شاعری کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے فن کو مسلمانانِ برصغیر میں جذبۂ حریت و جذبۂ آزادی پیدا کرنے کے لیے وقف کیے رکھا۔

وطن سے محبت آزادی کا جزوِ لاینفک ہے۔ حب الوطنی کا یہی جذبہ انسان کے اندر احساسِ آزادی بیدار کرتا ہے۔ ''کلیاتِ اکبر'' میں سیکڑوں اشعار و قطعات اس جذبے پر مبنی ہیں۔ ''کلیاتِ اقبال'' میں ''بانگِ درا'' اور ابتدائی دور کا کلام، اقبال کے جذبہ حب الوطنی کا بھرپور عکاس ہے۔

اکبر ہندوستان پر غیر ملکی قبضے اور غلبے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے ملک پر غیروں کی حکمرانی کا تلخ احساس ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے۔ قوم کو سامراج کی قید سے آزادی دلانے کے لیے انھوں طنزیہ اور مزاحیہ پیرایۂ اظہار اپنایا۔ کھل کر نظریات کے اظہار کو وہ اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے باعث نقصان تصور کرتے تھے۔ اکبر جس عہد میں شاعری کر رہے تھے وہ انگریزوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان حالات میں آزادی کے نغمے الاپنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر انھوں نے جو طنزیہ و مزاحیہ اسلوب اختیار کیا وہ ہر ایک کے لیے قابلِ قبول تھا:

ہوا کیوں شوق آزادی کا جب زنجیر ایسی تھی
دل ایسا کیوں ملا ہم کو کہ جب تقدیر ایسی تھی

وہ کہتا ہے جو سفاک اس کو کہہ کر یاد کرتا ہوں
کہ میں قید بدن سے خون کو آزاد کرتا ہوں

محمد رحیم دہلوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اکبر نے اپنے کلام سے قوم میں غیر ملکی غلبے کی تلخیوں کے احساس کو بیدار کیا لیکن وہ برطانوی سامراج کے عروج کا زمانہ تھا اور قوم کا شیرازہ قطعی بکھرا ہوا تھا۔ اس لیے وہ کھل کر مقابلہ کرنے میں قوم کا نقصان تصور کرتے تھے۔''(۱)

جلیاں والا باغ کے حادثے سے ہندوستان کے باشندوں کو بلا تفریق مذہب و نسل گہرا

صدمہ پہنچا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے آزادی کی صدائیں گونجنے لگیں۔ آزادی کے ان نعروں میں اکبرالٰہ آبادی کی شاعرانہ آواز بھی شامل ہو گی۔

ہند کے دل کو لبھا لیتا ہے مل کا یہ فسوں　　کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتوں
پائے کوباں کوئے زنداں میں نیا ہے مجنوں　　لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں
آتی ہے آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

اکبر اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ہندوستان کی آزادی کا خواب ہندو مسلم اتحاد کے بنا شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا لہٰذا انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم یکجا ہو کر سامراجی قوتوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانے کا درس دیا۔ ان کی شاعری میں ہندو مسلم اقوام کے لیے امن آشتی اور اخوت کا پیام موجود ہے:

نباہ اس کا ہمارے ساتھ ہو گا　　محرم اور دسہرا ساتھ ہو گا
تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم　　خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ

وہ انگریزی اقتدار کے سخت خلاف تھے۔ انھیں ہندوستانی اقوام خصوصاً مسلمانوں کی غلامی کا اور غفلت کا بے حد رنج تھا چونکہ وہ انگریزوں کے ملازم تھے اس لیے وہ ڈنکے کی چوٹ پر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے لہٰذا طنز و مزاح کے پیرائے میں انگریزی سامراج کے خلاف انھوں نے خوب لکھا۔ اکبر کی نظم ''جلوۂ دربارِ دہلی'' اس حقیقت کی غماض ہے کہ ان کے ایک ایک شعر میں بیرونی اقتدار اور مسلمانوں کی غلامی و کس مپرسی کا کتنا درد سمویا ہوا ہے۔ انھیں مسلمانوں سے اقتدار اور سلطنت کے چھن جانے کا بے حد قلق و افسوس تھا۔ غم زدہ تھے کہ ایک وقت تھا جب مسلمان پوری سلطنت کے مالک تھے۔ آج ان کی حیثیت محض ایک دربان کی سی ہے۔ ان کا کہنا ہے محفل بھی سامراجی طاقتوں کی ہے، ساقی بھی ان ہی کا ہے، فقط آنکھیں میری ہیں جو غلامی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے باقی بچی ہوئی ہیں:

پرتو تخت و تاج کا دیکھا　　اوج برٹش راج کا دیکھا
رخ کرزن مہراج کا دیکھا　　رنگ زمانہ آج کا دیکھا
چرخ ہفت طباقی ان کا　　اوج بخت ملاقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا　　محفل ان کی ساقی ان کا

سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں　　اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں　　شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''اکبر ہر قسم کی غلامی کے خلاف تھے۔ خواہ وہ سیاسی ہو یا ذہنی، بلکہ ذہنی غلامی سیاسی غلامی کا بدترین نتیجہ ہے۔ اکبر کی یہ جنگ سامراجی

حکمرانوں کے خلاف تھی اور دیسی مصلحین اور پرستارانِ مغرب کے خلاف بھی تھی۔ یہ کش مکش وقتی نہیں تھی، طویل عرصے کے لیے تھی۔ اکبر کو اپنے موَقف کی مضبوطی اور ساتھ ہی اپنے وسائل کی کمی کا بھی احساس تھا۔ تاہم انھوں نے غلامی ومحکومی کی شب تاریک میں اپنے فن کے ذریعے جہاد جاری رکھا۔ ان کی شاعری احساس اور جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔'' (۲)

آزادی اور غلامی ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ وہ ذہنی غلامی کو سیاسی غلامی سے زیادہ خطرناک قرار دیتے ہیں۔ ذہنی طور پر محکوم انسان کبھی بھی حقیقی آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے اندرونی قویٰ اور ذہنی صلاحیتیں اس قدر زنگ آلود اور مایوسی کا شکار ہو جاتی ہیں کہ وہ عملی طور پر حقیقی آزادی کے حصول کی جدوجہد نہیں کرتا۔ اس لیے وہ اپنے کلام میں پہلے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل ودماغ سے احساسِ مرعوبیت اور احساسِ محکومی نکالنا چاہتے ہیں۔ ماہرالقادری اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''اکبرالہ آبادی کی شاعری ''انقلاب آزادی'' کی درحقیقت نقیب تھی، انھوں نے طنز وظرافت کے پیرایہ میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہیے تھا۔ برطانیہ کے انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ نے شاید نہ سمجھا ہو مگر جن کے لیے کہا گیا تھا انھوں نے سمجھ لیا کہ ان مسکراہٹوں کے پردے میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔'' (۳)

اس حقیقت سے مفر نہیں کہ انگریز اپنے جدید اسلحہ، انتظامی صلاحیتوں، سائنس وٹیکنالوجی اور مشینوں کے استعمال کی بدولت اہلِ ہندوستان کو غلام بنا چکا تھا۔ اکبر کا کلام اسی خوئے غلامی کو مٹا کر برصغیر کے لوگوں میں آزادی کی امنگ اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ وہ سیاسی اقتدار اور سلطنت کے حصول کی بات بعد میں کرتے ہیں ان کا کلام پہلے ہندوستانیوں کو آزادی کے حصول کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرتا ہے:

گو سانس چل رہی ہے خوں اب نہیں جہندہ
مشرق بہ دست مغرب مردہ بدست زندہ

کیا پوچھتے ہو طوقِ غلامی کو کدھر ہے اپنا ہی تعلق ہے یہ اور اپنا ہی گھر ہے
پیدا ہے غلامی زن و فرزند کے دم سے پروانہ ہو ان کی تو پھر آزاد بشر ہے
ایسے بھی ہیں طینت ہی میں جن کی ہے غلامی پابندی دنیا کا رگِ دل میں اثر ہے

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''اکبر کو اجنبی حکمرانوں کے تسلط واقتدار کا اتنا شکوہ نہیں تھا جتنا زیادہ محکوموں کے احساس مرعوبیت کے وہ شاکی تھے، اور متاسف ومتالم

> نظر آتے تھے۔ ان کے خیال میں حکمران (اور وہ بھی اجنبی حکمران) کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اپنے قائم کردہ نظامِ حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے محکوم قوم کے دل سے خوئے آزادی اور ذہن سے بوئے غیرت مٹا دے۔''(۴)

اکبر کا پیامِ آزادی اس عہد کی سیاسی صورتِ حال کے عین مطابق ہے۔ اپنی تہذیب وثقافت کی حفاظت، معاشرتی وقار کی بلندی، سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت، معاشی و اقتصادی مضبوطی، خودداری، خود شناسی اور قومی غیرت وحمیت کو ملکی آزادی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان خصوصیات کے بغیر سامراج سے ٹکر لینا، جان اور مال کے ضیاع کے مترادف ہے۔ وہ مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کے حصول کے لیے جمہوری نظریات، آزادی پسندانہ رجحانات اور حریت پسندانہ خیالات سے بخوبی آشنا تھے۔ برصغیر کے مستقبل کے سیاسی خدوخال ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ باوجود غلامی کے وہ مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کے لیے پُر امید تھے۔ اس قومی مشن کی صدا ان کی شاعری سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے:

میں بھی ہوں بدل موئد آزادی کا لیکن اِک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر
آزاد ہو اس لیے کہ اغیار ہوں قید مطلب یہ نہیں کہ خود ہوں غیروں کے اسیر

سید ابوالخیر کشفی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگر آج اکبر زندہ ہوتے تو اس برصغیر کی عوامی زندگی اور سیاست میں وہ جمہوری اور آزادی پسند رجحانات کے بڑے نمائندے سمجھے جاتے کیوں کہ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کو کہنا اور اس کے لیے لڑنا انھیں خوب آتا تھا۔''(۵)

اکبر کے کلام میں محکومی کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ وہ سامراجی پالیسیوں، ہندوستانی سیاست، احساسِ غلامی، استعمار کے اوچھے ہتھکنڈوں اور ہندوستانیوں کے جملہ مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ استعماری قوتیں مقامی لوگوں کو محکوم بنانے اور استبداد ڈھانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہیں۔ اصلاحات (Reforms)، کونسلری اور امور سلطنت میں شمولیت کے ذریعے ملکی باشندوں کو بے وقوف بنایا گیا تا کہ انھیں دامِ غلامی میں اچھی طرح پھنسایا جا سکے۔ انگریزوں نے ''جمہوری طرزِ حکومت'' کی آڑ میں ہندوستان کے شہروں میں کونسلیں اور Municiple Bodies قائم کیں لیکن ان کونسلوں کا مقصد ہندوستانیوں کو غلامی و محکومی کی زنجیروں میں مضبوطی سے جکڑنے کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اصلاحات، ممبری اور کونسل کے چکر میں پڑ کر آزادی کے اصل مدعا سے کنارہ کشی کر لیں۔ انگریزوں کی یہ حکمتِ عملی اس ماہر طبیب کی سی تھی جو مریض کو ادویات کا عادی بنانے کے لیے حبوب (Pills) پر شیریں تہہ (Sugar Coated) چڑھا دیتا ہے اور مریض اس زعم کا شکار ہو جاتا ہے کہ یہ تو

کوئی میٹھی چیز ہے۔ بعینہٖ انگریزوں نے بھی ہندوستان کے باشندوں کو جدید Reforms کی صورت میں کئی سبز باغ دکھائے تا کہ یہ صدائے آزادی بلند نہ کر سکیں لیکن اکبر استعمار کی مکر و فریب پر مبنی ان تمام چالوں سے بخوبی آگاہ تھے:

پاؤں کو بہت جھٹکا ٹپکا زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی
تدبیر بہت کی اے اکبر تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

دل کش بہت ہے افعیِ گیسوئے اختلاف
کونسل سے کیوں کہوں کہ ترے بِل میں کچھ نہیں

کسی سمت کونسل کی ہے دل میں چوٹ
عوض لٹھ کے آپس میں چلتے ہیں ووٹ

ماہر القادری اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''اکبر الٰہ آبادی کے شعروں نے افرنگ کی سیاست اور تہذیب کے خلاف انقلاب کے لیے ذہنوں کو تیار کیا۔ ہند و پاکستان کی آزادی کی تاریخ میں شعر و ادب کا جب ذکر آئے گا تو اکبر الٰہ آبادی کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ آج سے ۳۵ سال قبل پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ، حکومتِ غیر کی کیا مرعوبیت اور فسوں کاری تھی۔ آزادی کا نام نکالتے ہوئے لوگوں کو پسینہ آتا تھا۔'' (۶)

جب پورا ہندوستان استعمار کے قبضے میں تھا تو اکبر اس وقت اپنے وطن کی آزادی کے لیے علم بلند کیے ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد پورے ہندوستان میں کوئی بھی آزادی کا متوالا نظر نہیں آتا تھا۔ اکبر نے اس نازک دور میں اپنی ملازمت داؤ پر لگا کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر سامراج کے خلاف اپنی شاعری کی وساطت سے ایک مردِ مجاہد کی طرح جہاد کیا۔ بقول ظفر احمد صدیقی:

''اکبر انگریزی حکومت کے ملازم تھے لیکن ان کا دل مغرب کی سیاسی اور ذہنی غلامی سے باغی تھا۔ ظرافت کا پیرایہ اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس پردہ میں وہ سب کچھ کہہ سکتے تھے۔'' (۷)

اکبر عمر بھر مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے خواہاں رہے۔ ایسا شخص جس نے اپنی شاعری مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے جگانے اور ان میں جذبۂ حریت بیدار کرنے کے لیے وقف کر دی ہو،

وہ تحریکِ آزادی کا مخالف کیونکر ہو سکتا ہے؟ وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے ہندوستان کی عملی سیاست اور ظاہری طور پر انگریزوں کی مخالفت سے گریزاں ضرور رہے لیکن ان کی رگ رگ میں جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ آزادی سمایا ہوا تھا۔ یہ جذبہ ان کی ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کی تہہ میں ہر جگہ موجزن ہے:

مفر فریادیوں سے اپنے تم ہرگز نہ پاؤ گے
اثر میں تیز ہو گی ، آہ کو جتنا دباؤ گے

کیا شرف بخشیں گی تم کو عرش پر یہ کاوشیں
جب زمین پر تم کو غیروں کی غلامی ہو گئی

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدعائے خاص
جس رخ ہے قافیہ میرا مطلب بھی ہے وہی

لطف آزادی کی دل میں بڑھ گئی ہے چاشنی
اب تو شیشے میں اترنے کی نہیں یہ جلیاں

اکثر یہی ہے حالتِ قانون مغربی
آزادیوں کی قید میں روح ان کی ہے پھنسی

ڈاکٹر افصح ظفر اکبر کے فلسفۂ آزادی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اکبر ہندوستانی تاریخ کے جس دور سے تعلق رکھتے ہیں، وہ نئے اور پرانے خیالات وافکار اور نظریات کے ٹکراؤ کا دور ہے۔ ان کا دماغ مذہبی تعلیم سے نشوونما پانے کے باوجود سیاسی آزادی کا طلب گار رہا، دل اس کھوئی ہوئی عظمت کے لیے بے چین رہتا، جو کبھی واپس نہ آ سکتی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانی عنانِ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، لہٰذا اکبر کے اندازِ نظر میں مسلم ہونے کے ناطے اس کا براہِ راست غم جھلکتا ہے۔'' (۸)

اقبال کی جذبۂ حب الوطنی پر مبنی شاعری کی شروعات نظم ''ہمالیہ'' سے ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ بعد ازاں ''بانگِ درا'' کی نظموں تک جاری رہا۔ اقبال کی انقلابی شاعری برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو غلامی کی پستی اور جہالت کی گہرائیوں سے نکال کر آزادی اور عظمت رفتہ کی طرف لے جاتی ہے۔ انھوں نے شاعرانہ سلیقے سے ہند کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کا تصور دیا، یہی ان کی شاعرانہ عظمت ہے جو انھیں دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ سامراج دشمنی اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اقبال کی

شاعری آگے چل کر حصولِ آزادی کی منزل پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ سامراج دشمنی کے جذبے نے ان کی شاعری میں قومی وملی ہمدردی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ وطن کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کی شاعری اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یورپ میں قیام کے دوران ان کے وطنی نظریات میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ اس کے بعد وہ قوم اور وطن کے تصورات سے آگے بڑھ کر ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور آزادی کے خواب دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن عقیل اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال نے اپنے فلسفے کے ذریعے مسلم ملت اور دنیائے اسلام کے ناقابلِ تقسیم ہونے پر اصرار کیا۔ انھوں نے برعظیم کے مسلمانوں پر آزادی کی نعمتوں کو آشکار کیا اور انھیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی دعوت دی۔''(۹)

اقبال کو ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے قلبی محبت تھی۔ انھیں اپنے وطن کے صحرا، دریا، کوہ و بیاباں، چشمے، وادیوں، کھیت و کھلیانوں سے شدید انس تھا۔ ''ترانۂ ہندی'' میں وہ اپنے وطن کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم ، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی ، دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ، ہندوستاں ہمارا

اکبر کی طرح اقبال بھی شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے لیکن جب ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ہندو صرف اپنے مفادات کے لیے سیاست کر رہا ہے اور انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد مسلمان، ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے تو انھوں نے فقط مسلمانوں کی آزادی اور بیداری کی خاطر جدوجہد کا آغاز کیا۔

سامراج کے پنجہ واستبداد سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اقبال نے اتحاد و یگانگت کی پرزور تاکید کی۔ انھوں نے باہمی نزع اور کشمکش کو بھلا کر مسجد و مندر کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ''نیا شوالہ'' جیسی نابغہ روزگار نظم تخلیق کی جو اہلِ ہند کو امن وآشتی اور اخوت ومحبت کا درس دیتی ہے۔ انھیں خاکِ وطن کا ذرہ ذرہ ایک دیوتا کی مانند نظر آتا ہے۔ اہلِ ہندوستان کی غلامی اور غفلت انھیں ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ نظم ''تصویرِ درد'' میں انھوں نے ہندوستان کے جگمگاتے ہوئے دلآویز نظاروں پر خون کے

آنسو بہائے ہیں اور اپنی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے اس حقیقت کو بھی طشتِ از بام کیا ہے کہ جو قومیں آزادی کے لیے جدوجہدِ مسلسل کو ترک کر دیتی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ ان کا وجود دنیا کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں وطن سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور اس نظم میں اقبال اپنے وطن پر بجا طور پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہا اور ان کے افکار میں مختلف حالات کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ وہ ایک زمانے میں ہندوستانیت کے جذبے سے سرشار تھے جس سے متاثر ہو کر انھوں نے ''تصویرِ درد''، ''ترانۂ ہندی''، ''نیا شوالہ''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' جیسی قومیت اور وطنیت سے لبریز نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔''(۱۰)

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ ، اک نیا شوالا اس دیس میں بنا دیں
(نیا شوالا)

بیاباں محبت دشتِ غربت بھی ، وطن بھی ہے
یہ دیرانہ قفس بھی ، آشیانہ بھی ، چمن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
(تصویرِ درد)

سامراجیت اور استعماریت سے آزادی کے حصول کا جذبہ اقبال کی شاعری میں شروع سے آخر تک موجود رہا۔ اس نے اپنی شاعری میں جو فلسفہ خودی پیش کیا ہے درحقیقت وہ فلسفہ آزادی کی ایک صورت ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آزادی کی جو تحریکات جنم لے رہی تھیں، انھوں نے اپنے فلسفہ خودی سے انھیں مزید تقویت پہنچائی اور اسے فلسفۂ آزادی کے سانچے میں ڈھال کر تحریکِ آزادی کو جذباتی اور عملی طور پر قوت بخشی۔ وہ اپنی انقلابی شاعری میں ''مردِ قلندر'' اور ''شاہین'' کا جو عظیم تصور پیش کیا ہے، اس نے تحریکِ آزادی کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اقبال نے آزادی کو دنیا کی عظیم نعمت قرار دیا۔ وہ استعمار سے آزادی کے بدلے کسی قیمت پر

سمجھوتے کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنی شاعری کی وساطت سے ہندوستانیوں میں آزادی اور بیداری کا ولولۂ تازہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ آزادی کو زندگی اور غلامی کو موت قرار دیتے ہیں۔ اسی جذبہ آزادی سے متاثر ہو کر انھوں نے نظم ''آزادی اور الہام''، نظم ''بیداری ایام''، نظم ''آزاد اور محکوم'' اور نظم ''مکر وفن خواجگی'' تخلیق کی۔

اقبال ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی کو غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ مردِ غلام کو نا قابلِ بھروسہ تصور کرتے ہوئے فقط ''مردِ حُر'' کی دور اندیشی کے دل سے معترف ہیں۔ وہ آزادی کے لیے ہمت اور جہد مسلسل کو ضروری قرار دیتے ہیں:

غلامی کیا ہے ؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
اس سراب رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اقبال ہندوستان کی عام بیداری اور اس کی سیاسی آزادی کے ہمیشہ دل سے خواہاں رہے۔ وہ اپنی نظم ''آزاد اور محکوم'' میں غلامی کی زندگی کے ہر لحظہ کو مرگِ مفاجات اور غلامی کو موت سے بھی بدتر قرار دیتے ہیں۔''(۱۱)

اقبال کا پیام ہندوستان کی آزادی، خوش حالی اور روحانی سربلندی ہے۔ ان کا کلام ہندوستان کی سیاسی اور سماجی اقدار تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کی شاعری نے وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو توانائی اور تحریک بخشی۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے صدقِ دل سے خواہاں تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی غربت، افلاس اور بیروزگاری کا سبب غلامی کو قرار دیتے ہیں۔ وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اہلِ ہند کو ذوقِ یقین کی دولت سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں اور بے یقینی کو غلامی سے بدتر خیال کرتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

وہ انگریزی تسلط کو ہندوستان کی ترقی اور خوش حالی میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی چکا چوند سے مرعوب ہونے والے غلام ذہنوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سن، اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بہتر ہے بے یقینی

انقلابِ روس کے بعد بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے مزدور اور کسان آزادی کی انگڑائی لے کر بیدار ہوئے۔ اقبال اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں میں ایک نیا ولولہ، امنگ اور جذبۂ آزادی پیدا کیا۔ انھوں نے مزدوروں اور غریبوں کی اہمیت کے پیشِ نظر اردو کی پہلی نظم ''خضرِ راہ'' تخلیق کی۔ نظم ''خضرِ راہ'' میں ہندوستان کے مزدور اور پس ماندہ طبقے کے لیے خوابِ غفلت سے بیداری کا پیغام نمایاں ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی طرح اقبال کی نظم ''فرمانِ خدا (فرشتوں سے)'' میں اقبال غریبوں میں جذبۂ حُریت پیدا کر کے سامراجیت کی مضبوط دیواروں کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
(''فرمانِ خدا'' فرشتوں سے)

اقبال نے افرادِ ملت کو 'خودی' کی ترغیب دے کر انھیں آزادیٔ وطن کے لیے متحرک کیا۔ اپنے کلام کے ذریعے انھوں نے جذبۂ حریت، محکومی سے نفرت، معاشرتی عدل و انصاف اور رواداری کا پیغام عام کیا۔ ''ضربِ کلیم''، ''بالِ جبریل'' اور مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں وہ ہندوستان کی غلامی اور مسلمانوں کی نااتفاقی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری جدوجہد آزادی کی ایک عملی تصویر ہے۔

ان کی فکر میں سیاسی نظریات کا کوئی منظم و مربوط نظام نہیں ملتا۔ ''کلیاتِ اقبال'' میں مسلمانانِ ہند کی غلامی و محکومی، انقلاب اور آزادی سے متعلق جو اشعار موجود ہیں وہ بکھری ہوئی صورت میں ملتے ہیں۔ ان کے ہاں جو سیاسی تصورات ملتے ہیں ان کا مقصد مغربی استعمار کے جور و استبداد پر کڑی تنقید اور اہلِ مشرق کو ان کی محکومی سے نجات دلانا ہے۔ جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ آزادی سے

سرشار ہو کر جب وہ اس نوع کی شاعری کرتے ہیں تو ''ہندوستان کی آزادی'' کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور بن جاتا ہے۔ اس خاکے سے مسلمانانِ برصغیر کی بیداری کے دھندلے نقوش صبحِ آزادی کی صورت میں نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ مصورِ پاکستان کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اقبال چونکہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی تھے اس لیے انھوں نے اپنی منطقی و فکری جدوجہد کا رخ حصولِ آزادی کی طرف موڑ دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال نے سیاسی تحریکوں کو بہت متاثر کیا ہے جس طرح روسو اور والیٹر فرانس میں ایک زبردست انقلاب کے پیش رو ثابت ہوئے، اسی طرح اقبال بھی ایشیا میں ایک عظیم الشان ذہنی انقلاب کے پیامبر ثابت ہوں گے اور پاکستان ۔۔۔۔ ایک اسلامی وطن کی تخلیق تو اب ایک حقیقت ثانیہ بن چکی ہے۔'' (۱۲)

اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی، اس وقت مشرق کے سیاسی افق پر مسلمانوں کی حکمرانی کا آفتاب اپنی ہزار سالہ تابانی کے جوہر دکھلا کر غروب ہو رہا تھا لیکن کرۂ ارض پر انقلاب کی شفق کے آثار موجود تھے۔ مشرق کی صدیوں پر محیط جہاں بانی و جہانگیری دم توڑ رہی تھی۔ مغرب کی ذہنی، فکری، تہذیبی اور سیاسی فتوحات کا ناقابلِ شکست سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اہلِ مشرق کے دلوں میں محکومی، پستی اور زوال کا نقش قائم ہو چکا تھا۔ فرنگی تہذیب کی نقالی و تقلید اہلِ مشرق کی ذہنی مرعوبیت کے پول کھول رہی تھی۔ اہلِ مشرق خصوصاً مسلمانوں کی بے کسی و درماندگی کے احساس نے اقبال کی سیاسی فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا اور وہ اہلِ مشرق کی آزادی کے خواب دیکھنے لگے۔

اقبال محکومی سے نجات اور آزادی کے حصول کے لیے شعور کی بیداری کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کلام کے ذریعے اہلِ مشرق میں پہلے داخلی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور بعد ازاں آزادی کے حصول کے لیے خارجی اور عملی طور پر خطبات بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ فرنگی تہذیب سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ یہ آزادی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب کی مادیت اور عقلیت کے نشے میں ڈوب کر اہلِ مشرق آزادی تو کُجا مدہوشی و خود فراموشی کا شکار ہو چکے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کی اسی غفلت اور ذہنی محکومی نے اقبال کو بے قرار کر دیا اور ان کی یہ فکر ''بانگِ درا''، ''پیامِ مشرق''، ''جاوید نامہ''، ''زبورِ عجم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اقبال ایک طرف اہلِ مشرق کی محکومی و غلامی پر تنقید کر کے انھیں آزادی کے حصول کے لیے آمادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی استعماریت اور فرنگی تہذیب سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں:

تھا جو 'ناخوب' بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی

فیض فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش

تاثر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لَے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو
مجھ کو تو گِلا تجھ سے ہے ، یورپ سے نہیں!

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اقبال زندگی بھر عظیم محبِ وطن رہے۔ وہ زندگی بھر برصغیر کی سیاسی محکومی پر تڑپتے رہے۔ وہ اپنے دیس کے بندوں کی غلامانہ ذہنیت کا ماتم کرتے رہے اور ہمیشہ وطن کی آزادی کے خواب دیکھتے رہے۔'' (۱۳)

اقبال کے نزدیک مشرق اور مغرب بصارت اور دل کے مختلف موذی امراض کا شکار ہیں۔ اہلِ مشرق غلامی اور تقلید جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہیں تو اہلِ مغرب کو اپنے ''جمہوری نظام'' پر غرور ہے:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

اقبال ایک ایسے مردِ قلندر ہیں جن کی آنکھ مسلمانانِ برصغیر کے تنزل سے نمناک ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان پستیِ فطرت، ضمیر فراموشی اور بندۂ تسلیم و رضا بن چکا ہے۔ مسلمان آزادی کے مقصدِ اعلیٰ سے بھٹک کر محکومی کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ اسلاف کی جرأت و بہادری جن سے تقدیرِ امم تشکیل پاتی تھی اس کی جگہ موسیقی اور طاؤس و رباب نے لے لی ہے۔ مسلمان جوشِ کردار اور جوہر ذاتی سے محروم ہو چکا ہے۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

اکبر اور اقبال نے مسلمانانِ برصغیر کو ایک ولولۂ تازہ دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خطرات اور غلامی کی صعوبتوں سے آگاہ کیا۔ محکومی کے قصرِ ذلت سے نکال کر قوم کو آزادی کے باوقار مقام پر فائز کیا۔ ان کی شاعری درحقیقت قوم کی زبوں حالی کا نوحہ، پیغامِ حریت اور درماندگی کا تریاق ہے۔ ان کا کلام بصیرت سے نا آشنا، جذبۂ شوق سے بے فکر، سلیقۂ افکار سے عاری اور اپنے منشا و مقصد سے بے خبر قوم کے لیے مژدہ آزادی ہے۔ انھوں نے محکومیت کی چکی میں پسے ہوئے مردہ ضمیر اور مایوسی کے اندیشۂ تاریک میں گرفتار مسلمانان ہند کو جرأت و بہادری سے حصولِ آزادی کا پیام سنایا۔ انھیں اللہ پاک نے جن بے مثال اور لازوال صلاحیتوں سے نوازا تھا اکبر ان قابلیتوں کے دل سے معترف تھے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ برصغیر پاک و ہند کے خطے میں صرف اقبال ہی وہ واحد ہستی ہیں جو نامساعد حالات کے بھنور میں پھنسی ہوئی مسلمانوں کی کشتی کو ساحلِ آزادی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ رحیم دہلوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اکبر، علامہ اقبال کو قومی رکنوں کے نگہبان اور دشمنِ فتنۂ رقیباں کہتے اور انھیں دیوؤں کے لیے سلیمان سمجھتے تھے۔ اسی قومی رکنوں کی نگہبانی اور فتنہ رقیباں کی دشمنی نے اقبال کے دل میں آزاد پاکستان کا تصور پیدا کیا۔ اکبر کا خواب سچا تھا۔ اقبال بے شک دیوؤں کے سلیمان ثابت ہوئے۔''(۱۴)

آزاد پاکستان اکبر اور اقبال دونوں کا مشترکہ خواب تھا۔ اس خوب صورت خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اکبر نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز اختیار کیا تو اقبال نے سنجیدہ پیرایۂ اظہار اپنایا۔ دونوں شعرا نے اپنے اپنے اسلوب میں قوم کو نفسیاتِ غلامی اور اسرارِ حریت سے آگاہ کیا۔ مسلمانانِ برصغیر کے لیے آزاد ریاست کا قیام اکبر کا دیرینہ خواب تھا۔ اقبال نے مفکرِ پاکستان کی حیثیت سے اس خواب کی عملی تعبیر پیش کر کے اسے سچ کر دکھایا۔ آزاد اور خودمختار پاکستان کا قیام دونوں شعرا کی منزلِ مقصود تھی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد رحیم دہلوی، حضرت اکبر کے شب و روز، کراچی: مکتبہ رضویہ، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۹

۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، بزمِ اکبر سے بزمِ اقبال تک، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۶۲

۳۔ ماہر القادری، جز و زیست از پیغمبری، مشمولہ: اکبر اس دور میں، مرتبہ: اختر انصاری، کراچی: بزمِ اقبال، ۱۹۵۲ء، ص: ۱۰۷

۴۔ غلام حسین ذوالفقار، اکبر اور اقبال نئے تناظر میں، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۹

۵۔ ابوالخیر کشفی، اکبرالہ آبادی اور مغربی انقلاب، مشمولہ: اکبر اس دور میں، مرتبہ: اختر انصاری، کراچی: بزمِ اقبال، ۱۹۵۲ء، ص: ۱۱۵

۶۔ ماہر القادری، جزو زیست از پیغمبری، مشمولہ: اکبر اس دور میں، مرتبہ: اختر انصاری اکبر آبادی، کراچی: بزمِ اکبر، ۱۹۵۲ء، ص: ۱۰۶

۷۔ ظفر احمد صدیقی، دربارِ الٰہی میں پیش کش، مشمولہ: حیاتِ اکبر از سید عشرت حسین، مرتبہ: ملا واحدی دہلوی، کراچی: بزمِ اکبر، ۱۹۵۱ء، ص: ۳۹

۸۔ افصح ظفر، ڈاکٹر، اکبرالہ آبادی ایک سماجی و سیاسی مطالعہ، لاہور: دارالشعور پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص: ۸۴

۹۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، آزادی کی قومی تحریک: تحقیق و تجزیہ، لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، ۲۰۰۷ء، ص: ۷۶

۱۰۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مسائل اقبال، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۴۱

۱۱۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۰

۱۲۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مسائلِ اقبال، ص: ۱۶۷

۱۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال ایک مطالعہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۷ء، ص: ۸۰

۱۴۔ محمد رحیم دہلوی، حضرت اکبر کے شب و روز، ص: ۳۸

☆......☆......☆